شورش کاشمیریؒ

شاہ جی کی عادتیں

شاہ جی خوبصورت عادتوں کے ایک دلفریب انسان تھے۔ قرون اولیٰ میں ہوتے تو صحابہ کی صف اوّل میں ہوتے۔ اور کربلا میں سیدنا حسینؓ کے ساتھ شہید ہوتے۔ انکی درویشی اور فقیری میں بوئے اسد للٰہی بھی تھی اور غیرت شبیری بھی۔ وہ ابوذر غفاریؓ کی طرح املاک پیدا کرنے کے ہر طریق کو ناجائز سمجھتے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمتوں سے بے پناہ ارادت رکھتے تھے۔ عہد عتیق کے روم و یونان میں ہوتے تو ڈیماسیتھنیز یا سسرو ہوتے۔ جنہوں نے خطابت کے اصول مدون کئے۔ ان لوگوں کی عصری کا شکار کرتے رہے گمشدہ یونان میں ہوتے تو عجب نہ تھا کہ سقراط کی طرح انہیں بھی زہر کا پیالہ پینا پڑتا۔ ویدوں کے ہندوستان میں ہوتے تو ہمالیہ کے غاروں میں رشیوں کے ساتھ قدم ملا کر چلتے اور گیتا کے ورق اجالتے پھرتے یا پھر گوتم بدھ کے ساتھ ہوتے جن کی یادیں ایلوار اور اجنتا کے محیر العقول غاروں میں نہ مٹنے والی خطابت کا شاہکار محسوس ہوتی ہیں۔

شاہ جی ایک عجیب و غریب تصویری مرقع تھے۔ ان کے چہرے مہرے پر فقرائے اسلام کا طنطنہ اور دانشوران یونان کا ہمہ ہالہ کئے ہوئے تھا۔ آدمی ان کے نزدیک آکر اور نزدیک ہو جاتا تھا۔ ان کے مخالف وہی لوگ تھے جو ان سے دور رہے تھے۔ یا پھر انگریزوں کے پٹھو، مسلمانوں کے دشمن اور قادیانیت کے متبع وہ نور کا تڑکا تھے کہ اندھیری رات اس کی گرفت میں آکر فقرو ہو جاتی ہے یا پھر اوس کا قطرہ تھے کہ غنچوں کا منہ دھلاتے اور پھول کھلاتے تھے۔ ان کی عادتیں جو ان کے انفاس کے ساتھ ساتھ چلتی تھیں۔ اتنی سادہ اور عجیب تھیں کہ عظیم کتابی انسانوں کے سوا ان کا وجود فی زمانہ شاذ ہی ملتا ہے۔ مثلاً

۱۔ وہ مستقبل کے بارے میں کچھ نہیں سوچتے تھے۔ ہر چیز کو اللہ کی رضا کے تابع سمجھتے حال سے انہیں بس اتنا ہی تعلق تھا کہ اس کو جھنجھوڑتے اس پر کڑھتے یا کبھی کبھار اس پر قہقہے لگاتے تھے۔ البتہ وہ ماضی کے انسان تھے۔ امور ماضی ہی سے محبت کرتے تھے۔ ان کا اوڑھنا بچھونا، چلنا پھرنا، کھانا پینا، سونا جاگنا، سوچنا سمجھنا، بولنا ہنسنا، سب ماضی کا مرہون اثر تھا۔ اور اسلام کے ماضی کے سوا کسی بھی ماضی کے قائل نہ تھے۔ وہ تہبند اس لئے باندھتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تہبند باندھا کرتے تھے۔ وہ کسی بھی غذا کے عادی نہ تھے۔ ساگ ستو جو ملا خدا کا شکر کیا اور کھا لیا۔ میں نے ہری مرچوں کی رغبت کے سوا ان میں کسی شے کے لئے رغبت نہیں پائی انہیں بغیر پکائے بھی کھا جاتے اور قیمے میں بھون کر بھی۔

ٹھنڈا پانی کثرت سے پیتے۔ بلکہ تقریر کرتے وقت تھرماس ساتھ رکھتے تھے اور برف ہی چباتے چلے جاتے۔ انکا گلا برفاب سے اور کھلتا بلکہ کرارا ہوتا تھا۔

اکثر فرش پر ہی بستر کھول کر سو جاتے یا پھر بان کی کھردری چارپائی پر۔ وضو کے لئے لوٹا ہمیشہ ساتھ

رکھتے۔ جب پان کھانے کی عادت پختہ ہو گئی تو تیلیوں کی ایک غریب الحال ٹوکری میں پانوں کی ڈھولی، چونا، کتھا اور سپاری کی گولیاں کھدر کے ٹکڑوں میں لپیٹ لپاٹ کے رکھتے تھے۔

۲۔ سحر خیز تو تھے ہی۔ یعنی صبح کی نماز قضاء نہ ہونے دیتے۔ نماز انکی فطرت ثانیہ تھی۔ مگر رات گئے دیر سے سوتے اور یہ ان کی فطرت ثانیہ ہو چکی تھی۔ جلسوں میں آخری مقرر وہی ہوتے۔ اور ان کا کوئی جلسہ بارہ ایک بجے رات سے پہلے ختم نہ ہوتا تھا۔ اور صبح ہو جانا تو عام معمول تھا۔ جلسہ ختم ہو جانے کے بعد عقید تمندوں کا ہجوم گھنٹہ دو گھنٹہ گھیرے رکھتا جس روز جلسہ نہ ہوتا یا گھر پہ ہوتے تو محفل آرائیاں فرصت نہ دیتیں۔ وہی دو بجے شب کا سونا مقدر ہوتا۔ البتہ رمضان شریف کے مہینے میں یہ معول نہ رہتا۔ تراویح پڑھ چکنے کے بعد محفل جماتے اور سحری سے کچھ ہی عرصہ پہلے ذکر الٰہی میں مشغول ہو جاتے آخری برسوں میں حال یہ تھا کہ صحبت آرائیاں بالکل مختصر کر دی تھیں۔ وقت کا بڑا حصہ یاد الٰہی میں بسر کرتے۔ بلکہ صورت حال یہ تھی کہ عبادت کے لمحے قریب ہوتے تو دوستوں سے کہتے کہ بھائی میری گدائی کا یعنی اللہ سے مانگنے کا وقت ہے۔ محفل برخاست ہونی چاہیئے۔ پھر خود ہی اٹھ کھڑے ہوتے۔

۳۔ ہمیشہ ہی موٹا جھوٹا پہنتے، گھر میں بھی یہی حال تھا فقر و استغنا کی سچی تصویر تھے۔ مغربی تہذیب کے خفی و جلی اثرات کا سایہ بھی ان سے میلوں دور رہتا۔ میں نے ان کے گھر میں مغربی مصنوعات مغربی تصورات اور مغربی نظریات کا گزر تک نہیں پایا۔ ان کی فرنگ دشمنی اور یورپ بیزاری کا یہ عالم تھا کہ بس میں ہوتا تو اپنے گھر میں بجلی اور پنکھا بھی نہ لگواتے۔ ان دو چیزوں کے سوا میں نے ان کے ہاں کبھی کوئی یورپی چیز نہ دیکھی۔ ریڈیو کے وہ اتنے مخالف تھے کے سینکڑوں مرید تھے جنہوں نے ریڈیو سیٹ پیش کرنا چاہا۔ مگر جھنجھلا کر انکار فرمادیا۔ گھر میں استاد جی لانا چاہتے ہو؟

۴۔ راقم الحروف نے عرض کیا شاہ جی زمانہ بہت بڑھ چکا ہے۔ اپنے بچوں کو انگریزی مدرسوں میں داخلہ لے دیں۔ زمانہ کا تقاضا ہے فرمایا بابا مجھے معاف رکھو میں اس زمانہ کا آدمی نہیں۔ تم مجھے محمد قاسم نانوتوی اور محمود حسن کی روحوں سے بغاوت کرنے کی ترغیب دیتے ہو؟ یہ کیوں نہیں کہتے کہ تمہارے بچے مر جائیں۔ یا اپنے ہاتھوں بچوں کو قتل کر دوں۔

۵۔ انگریزوں سے نفرت کا یہ عالم تھا کہ "لعنت بر پدر فرنگ" ان کا نعرہ قلندری تھا اور موڈ میں آکر اس زور سے بلند کرتے تھے کہ در و دیوار گونج اٹھتے تھے۔

۶۔ کبھی کسی شخص کی غیبت نہیں کی۔ نہ دشمن کی نہ دوست کی صرف خیالات سے اختلاف کرتے یا ان پر سخت قسم کی جرح و قدح۔ ان کے نزدیک عیب بینی سب سے بڑا عیب تھا۔ جس شخص کی قومی غداری پر طبیعت منغض ہوتی فرماتے جو فصل بوئی ہے دعا کرتا ہوں کہ خود کاٹ کے مرے۔ میں نے ان کی زبان سے کبھی کوئی گالی نہیں سنی۔ البتہ فرنگیوں اور ان کے خانہ زادوں کے بارے میں درشت سے درشت الفاظ بھی کہہ جاتے تھے۔

۷۔ بظاہر ان کا کوئی کاروبار نہ تھا۔ ان کے خاص معتقدین مدد فرماتے تھے۔ مگر نہ تو کبھی چھپ کر بدیہ

قبول فرماتے اور نہ اس پر پردہ پوشی ہی کے قائل تھے۔ جب کوئی مٹھی بند کر کے کچھ دینا چاہتا تو مٹھی کھول دیتے کہ چھپاتے کیوں ہو کیا چوری کا مال ہے؟ جماعت سے ایک دمڑی نہ لیتے یہ واقعہ ہے کہ انہوں نے کسی جماعت سے کبھی نہ کرایہ وصول کیا نہ وظیفہ لیا نہ قرض حسنہ اور نہ اعانت قبول کی۔ ان کے مداح انہیں خود ہی بے نیاز رکھتے اور وہ ہر لحاظ سے بے نیاز تھے۔

جو بے نیاز کا بندہ ہے بے نیاز رہے۔

۸۔ ان کے پاس ایک بہت پرانا بٹوہ تھا مگر اس میں کچھ دھیلے اور پائیاں پڑی تھیں۔ جو ملتان کے ایک مجذوب نے دی ہوئی تھیں۔ انہیں بٹوہ میں تبرکاً رکھ چھوڑا تھا۔ فرماتے ان کی برکت سے بٹوہ کبھی خالی نہیں رہا۔

۹۔ فرماتے جو لوگ روٹی کے لئے جدوجہد کرتے اور اسی کے لئے جیتے ہیں ان میں اور ایک کتے میں کوئی فرق نہیں وہ بھی روٹی کے لئے بھونکتا اور دم ہلا کر مالک کے پیچھے پیچھے چلتا ہے۔ روٹی کوئی چیز نہیں اصلی چیز عقیدہ اور اس کے مطابق زندگی بسر کرنے کی دھن ہے۔

۱۰۔ مذہباً پکے مسلمان اور بہ لحاظ مسلک حنفی العقیدہ تھے۔ دیوبند کے مدرسۂ فکر کے پیرو۔ لیکن طبعیت میں کسی کے لئے تنفر نہ تھا۔ ہر فرقے کی اچھائیوں سے محبت کرتے۔ مرزائیوں کو تو مسلمان ہی نہ سمجھتے تھے۔ صوفیاء اور اولیاء کا بے حد احترام کرتے اور مزے میں آکر فرماتے بھئی میں تو چشتی بھی ہوں نقشبندی بھی، قادری بھی، صابری اور سہروردی بھی۔ مولانا داؤد غزنوی نے شکایت کی کہ مظہر علی اظہر اپنے بیٹے قیصر مصطفیٰ کی شادی پر باجا بجوا رہا ہے۔ فرمایا بھئی ان سے گلہ نہ کرو وہ تو محرم کے دنوں میں باجے بجوا کر تعزیہ نکالتے ہیں۔

۱۱۔ اپنے دوائر سے باہر عام مجلسی دعوتوں میں شاذ ہی شریک ہوتے تھے۔ میں نے انہیں اپنے بھائی یورش کاشمیری کے لئے دعائے مغفرت مانگنے کو کہا۔ تو فرمایا! اجی چھوڑو! اس ننھی کلی سے کون حساب لے گا۔ خدا ہماری اور تمہاری طرح تھوڑی ہے۔ قیامت کے روز چنگیز، ہلاکو، ہٹلر، مسولینی وغیرہ کا حساب ہی لمبا ہو گا ہماں شماں سے کون پوچھتا ہے۔

۱۲۔ وعدہ بہرحال پورا کرتے سال کے تین سو پینسٹھ دنوں میں تین سو تیس دن تقریریں فرماتے لیکن وقت کی پابندی ان کے بس کا روگ نہ تھا۔ جلسہ میں دیر سے پہنچتے اور جس کے ہاں جا کر ملنا ہو وہاں وقت مقررہ کا دو چار گھنٹے اوپر ہو جانا تو معمولی بات تھی۔ مولانا آزاد سے ملنے کا وقت طے کیا۔ وہ سیکنڈوں پر نگاہ رکھنے والے انگریز دو گھنٹے لیٹ پہنچے۔ وقت ہو رہا تھا۔ دوستوں نے متوجہ کیا مگر قیلولہ کرنے لگے گاندھی جی سے بھی یہی کیا۔ مولانا حبیب الرحمان کہا کرتے تھے کہ شاہ جی نے انگریز کے خلاف اتنا جہاد کیا ہے کہ کئی انسانوں کا مجموعہ بھی یہ نہیں کر سکا۔ مگر وقت کے اسراف کا یہ حال ہے کہ آج اگر یہ کہیں کہ فلاں روز ٹھیک اتنے بج کر اتنے منٹ پر شاہ جی کو وائسرائے لیگل لاج بھجوا دو ہم آزادی کا پروانہ دے دیں گے تو آزادی کبھی نہیں ملے گی کیونکہ شاہ جی اور وقت کی پابندی دو متضاد چیزیں ہیں۔

۱۳- اپنی تعریف سے کبھی خوش نہ ہوتے۔ نہ پسند کرتے نہ اجازت دیتے۔ اخباروں میں چھپنے چھپانے کے سخت خلاف تھے۔ انہوں نے پریس کانفرنس کا وجود ہی نہ دیکھا تھا۔ اخبارات کو عمر بھر کبھی کوئی بیان نہیں دیا۔ نہ مضمون لکھا۔ آزاد میں ان کے نام سے دو چار مضمون چھپے، وہ راقم الحروف کے لکھے ہوئے لیکن ان کی گفتگوؤں کا عکس تھے۔ اس معاملہ میں وہ عام لیڈروں کی کمزوریوں سے اتنے بالا تھے کہ ان کی ملکوتی صفات پر حیرت ہوتی تھی۔

۱۴- پان خود بناتے، چائے بھی خود ہی تیار کرتے، خود پیتے اور دوسروں کو پلواتے تھے۔ اللہ سے حد درجہ ڈرتے اور حضور ﷺ سے والہانہ ارادت رکھتے تھے۔

۱۵- ان کے پاس کوئی وسیع لائبریری نہ تھی۔ فرماتے قرآن کے سوا کسی اور کتاب کے مطالعہ کی ضرورت نہیں رہی نہیں پڑھی۔ ابتداءً خوب کتابیں پڑھی تھیں پھر مطالعہ کا یہ ذوق کچھ دنوں ساتھ رہا۔ آخر قرآن پاک ہی کو رفیق بنا لیا۔ مولانا طفیل منگلوری کی کتاب "مسلمانوں کا روشن مستقبل" ایک زمانہ میں ساتھ رکھتے اور ساتھیوں کو اس کے پڑھنے کا مشورہ دیتے تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کا "الہلال" ظفر علی خان کا "ستارہ صبح" انہوں نے ڈوب کر پڑھے تھے۔ علامہ اقبال کے کلام کا بڑے انہماک سے مطالعہ کیا تھا۔

۱۶- اپنی ذات کی ہر حال میں نفی کرتے اور جماعت کے دوستوں یا جماعت سے باہر کے انگریز دشمنوں کے قصیدے پڑھاتے اور دعائیں دیتے تھے۔

انگریز کا دوست میرا دوست نہیں ہوسکتا

جس طرح مولانا ظفر علی خاں کی صحافت کو یہ شرف خاص حاصل رہا کہ وہ جب تک جوان رہے پنجاب کے کاسہ لیس خاندانوں اور ان کے ناقوس ہائے خصوصی کے لئے دلچسپ الفاظ اور ترکیبیں وضع کرتے رہے اسی طرح سید عطاء اللہ شاہ بخاری اس معاملہ میں ممتاز و منفرد تھے کہ وہ "وفاداری بشرط استواری" کے خمیر میں گندھے ہوئے ان خاندانوں کو نہ تو خاطر ہی میں لاتے تھے اور نہ ان کے دل و دماغ پر ان کی طرف سے حرف اعتبار نقش ہوتا تھا۔

شہروں اور لوگوں کے بارے میں ان کی رائے بڑی نپی تلی ہوتی جس شخص کے بارے میں کوئی بھرپور رائے قائم کر لیتے پھر اس میں ترمیم نہ کرتے۔ اس سختی سے اس پر جمے رہتے کہ ردو بدل کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔

ان کا عقیدہ تھا کہ قدرت کبھی معاف نہیں کرتی۔ اللہ کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔ ان کی آنکھیں بہت کچھ دیکھ چکی تھیں۔ اور بہت کچھ دیکھ رہی تھیں۔ فرماتے برہنہ گفتن کا موقع نہیں ورنہ جو کچھ جہد آزادی کے دور میں ہوتا رہا اور برطانوی سرکار نے خود کاشتہ خاندانوں کے لئے جو کچھ کیا یا ان خاندانوں نے برطانوی سرکار کے لئے جو کیا وہ روداد اتنی تلخ ہے کہ عرش و فرش کانپ اٹھتے ہیں۔ اس معاملے میں وہ کئی واقعات

بیان کیا کرتے تھے۔ مرحوم امرتسر میں ایک بزرگ کرسی نشین، درباری، آنریری مجسٹریٹ، خان بہادر اور کیا کچھ نہیں تھے۔ امرتسر کے مارشل لاء نے سرکار میں انکا ستارہ چمکادیا۔ قصہ مختصر کہ تحریک خلافت ختم ہو گئی۔ جلیانوالہ باغ کا حادثہ بھی ابھر کر ٹھنڈا پڑ گیا۔ قید و بند کے ابتدائی دن بھی لد چکے تھے۔ شاہ جی خیر الدین کی مسجد میں جمعہ پڑھنے یا پڑھانے جاتے۔ جب وہ دروازے پر پہنچتے تو خان بہادر دروازے پر کھڑے ہوتے اور جھک جھک کر سلام کرتے۔ شاہ جی نے سلام کا جواب کبھی نہ دیا۔ چپ چاپ اندر چلے جاتے۔ شاہ جی کا انداز تھا کہ وہ اپنے قاتلوں کو بھی بخش دیتے تھے۔ ان جیسے عفو و در گزر کے عادی اور ہنستے بولتے شخص کا یہ رویہ دوستوں کے لئے معمہ تھا۔ خان بہادر نے اس روش کے باوجود سلام کرنا ترک نہ کیا۔ شاہ جی نے بھی قبول کے لئے نہ کبھی ہاتھ ہلائے نہ زبان اور نہ اس کی طرف آنکھیں ہی اٹھا کر دیکھا۔

ایک دن نیاز مندوں میں سے ایک نے سوال کیا "شاہ جی، خان بہادر صاحب آپ کو سلام کرتے ہیں۔ آپ جواب نہیں دیتے۔ وجہ کیا ہے" فرمایا، کوئی بات نہیں کبھی گھر میں ہوں تو پوچھ لینا۔ بات آئی گئی ہو گئی۔ کچھ دنوں بعد گھر میں تنہا تشریف فرما تھے کسی طرح خان بہادر کا ذکر چھڑ گیا۔ تو واقعہ بھی یاد آگیا۔ فرمایا "بات کوئی نہیں میں اس شخص کا دوست ہی نہیں ہو سکتا جسے انگریز دوست رکھتا ہو۔ یا جو انگریز کو دوست سمجھتا ہے۔ اصرار پر واقعہ بیان کیا کہ امرتسر کے مارشل لاء میں نیشنل بنک کے فرنگی مینجر کو مشتعل ہجوم میں سے کسی شخص نے چھت سے گرا کر ہلاک کر دیا۔ پولیس نے بہتیرا تلاش کیا لیکن مجرم کا سراغ نہ ملا۔ مقتول کی بیوی نے ملزموں کو پکڑ کر کیفر کردار تک پہنچانے کا مطالبہ کیا حکومت نے انعامی اشتہار نکالا کہ جو شخص ملزم کا پتہ دے گا اس کو اتنے ہزار روپے نقد انعام دیا جائے گا۔ ڈپٹی کمشنر نے نجی طور پر بعض "معززین" سے یہ بھی کہا کہ ان کی وفاداری کا امتحان ہے اگر انہوں نے مجرم کے پکڑوانے میں مدد کی تو موعودہ انعام کے علاوہ خطاب بھی دیا جائے گا۔ اور آنریری مجسٹریٹی بھی۔

مجرم نہ ملا۔ ان خان بہادر صاحب نے جو اس وقت تک خان بہادر نہ تھے اور محض علاقائی تھانیدار کے معاون ہی تھے اپنے محلے کی ایک غریب الحال بیوہ کے پاس گئے جس کا ایک ہی نوجوان بچہ تھا۔ اس سے کہا کہ تم اپنے بچہ سے کہو کہ وہ پولیس میں یہ بیان دے دے کہ میں نے بنک مینجر کو کوٹھے سے گرایا ہے میں تم سے حلفاً وعدہ کرتا ہوں کہ تمہارے بچہ کو دو ماہ کے اندر اندر رہا کرا لوں گا ورنہ حکومت سختی پر تلی ہوئی ہے۔ تمہارے بچہ کا نام لیا جا رہا ہے۔ پولیس نے پکڑ لیا تو رہائی ناممکن ہے۔ وہ جھوٹے گواہ ڈال کر بھی پھانسی پر لٹکوا دے گی۔ بڑھیا جھانسے میں آگئی۔ نوجوان بھی بے پڑھا لکھا اور بیمار و لاغر تھا فریب میں پھنس گیا۔ "خان بہادر" نے قرآن مجید پر حلف اٹھایا کہ دو ماہ تک ضرور ہی رہا کرا دوں گا۔ غرض نوجوان مذکور نے خان بہادر کی مخبری پر اپنے آپ کو پولیس کے حوالہ کر دیا۔ پھر جیسا کہ اسے کہا گیا اس نے اعتراف بھی کر لیا۔ مقدمہ چلا چٹ منگنی پٹ بیاہ موت کی سزا ہو گئی جو اسے آخر کار دار کے تختہ پر لے گئی۔ بڑھیا نے خان بہادر کا دامن پکڑا۔ خان بہادر اثنائے مقدمہ سے لے کر سزائے موت تک یہی اعلان کرتا رہا کہ فکر نہ کرو تمہارا بیٹا رہا ہو جائے گا۔ یہ صرف قانون کی کارروائی ہے۔ گورنر صاحب نے مجھ سے وعدہ کر رکھا ہے۔ شور نہ کرو۔ وہ رہا ہو

جائے گا۔ ضرور گھر آئے گا میں لے کر آؤں گا۔ بڑھیا ان طفل تسلیوں پر جیتی رہی۔ آخر ایک دن بیٹا پھانسی پا کر گھر آ گیا۔ خان بہادر صاحب پھانسی کے دن تک یہی تسلیاں دیتے رہے کہ فکر نہ کرو تمہارا بیٹا ضرور گھر آئے گا۔ اور بیٹا آ گیا۔ بڑھیا نے بیٹے کی لاش دیکھی تو سر پیٹ لیا۔ چلا اٹھی۔ ہاہا کار مچ گئی تب افشائے راز سے بھی کچھ نہ بنتا تھا۔

خان بہادر صاحب انعام و خطاب پا گئے آنریری مجسٹریٹی مل گئی۔ جائیداد بھی ہاتھ آ گئی۔ غرض سرکاری دوائر میں ان کا طوطی بولنے لگا۔ لیکن اس بڑھیا کا بیٹا واپس نہ آیا البتہ ایک دن ماں خود ہی اس کے پاس پہنچ گئی۔

قدرت کا غائبانہ ہاتھ مسکراتا رہا مکافات نے بہت دنوں کا چکر کاٹا۔ ایک نوجوان بیٹا اوباشوں کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔ آنریری مجسٹریٹی کو ایک ڈپٹی کمشنر کی ناراضی نے ہضم کر لیا کارخانہ کو آگ لگ گئی خود ٹانگ ٹوٹی اور تصویر عبرت ہو کر موت کی گود میں چلا گیا۔

شاہ جی نے کہا جب یہ شخص میرے سامنے آتا ہے تو اس کے ضمیر میں اسی کانٹے کی چبھن ہوتی ہے۔ خدا کا خوف نہیں۔ میرے سامنے اس بچے کی تصویر آ جاتی ہے جیسے وہ اس کی گردن مارنے کے لئے اپنا ہاتھ بڑھا رہا ہو۔ اور میں منہ پھیر لیتا ہوں کیونکہ مجھے اس کی جھریوں میں اس کی ماں کے آنسوؤں کی تہیں جمی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اور وہ بال کھولے چلا رہی ہے۔

ڈر اس کی دیر گیری سے کہ سخت ہے انتقام اس کا

یہ واقعہ سنا کر شاہ جی کانپنے لگے کہ اس دنیا میں یہ بھی ہوتا ہے۔ اور جب انگریزوں کے لئے غریبوں کے بچے کٹوانے والے ہمیں غدار کہتے ہیں تو فطرت بھی سرکوبی کے لئے ہاتھ اٹھا لیتی ہے۔

وہ بولتے نہیں موتی رولتے ہیں ان کا وجود چشمۂ صافی ہے

مولانا شوکت علیؒ

بخاری مرحوم جیسا اسلام کا شیدائی دنیا میں پیدا ہونا مشکل ہے

مولانا داؤد غزنویؒ

اے کاش! میں اس شخص کو مسلم لیگ میں لا سکتا؟ اگر یہ میرے ساتھ ہو تو چھ ماہ کے اندر اندر ملک میں انقلاب برپا کر دوں

نواب بہادر یار جنگؒ

انہوں نے خطابت میں انا الحق کی بنیاد رکھی ہے وہ بیک وقت سرود سمن اور دار و رسن کے خطیب ہیں

سردار عبدالرب نشترؒ